

نئی شاعری اور عہد حاضر کا المیہ (فردوسماج کے تناظر میں)

رضوانہ نقوی

پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو

ڈاکٹر ساجد جاوید

اسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو

یونیورسٹی آف سرگودھا

Abstract

Generally modern urdu poetry enumerates in "NEW POETR" but particularly in urdu poem's narration "NEW POETRY" meaning is that literary movement which emerged nearly 1958 and famed by the "LESANI TASHKEELAAT". This literary movement was not a bussinesslike incitement but a applied declaration of co concept poets and critics. Rejection and aberration was landmark of this movement which was superdded by scattered social and political native conditions. Mostly each literary reign discovers its own freshness and newness under its social, economical and political circumstances. After the dismemberment of 1947 topsyturvy conditions of native politics and international idealogical disorder created a congregational social tregady which gave the birth of a man who was interspersed ,jagged and was torn into pieces by iner and outer self. Till 1960 this social and human tregady touched to its peak of decline, this tregady and irregularity procreat the "NEW POETRY". new petry's excelling preference was insurrection and infraction , which is illustrious in the poems of all new poets in diverse countenances. "THE NEW POETRY" made changes in the basic grid of urdu poem and made it more flexible so that the urdu poets could acclaim significance beyond to fettered of grammar and countenance. Noteable name of "NEW POETRY" who work to visualised the new poetry indivisualy are, Iftakhar Jalib, Jeelani

Kamran, Abbas Athar, Anees Nagi, Saleem ur Rehman, Zahid Darr, Tabassum Kashmiri, Abdul Rasheed and Saadat Saeed whose poems enlightened the features of new poetry. NEW POETRY'S movment was end up in 1980 as a movement. This poetry broke the boundries of traditional poetry and use the human and social facts as a intervention to say the agony and tregady of mankind. In this article it is tried to indicate the social and human tregady of present age which is ruining the destiny of mankind.

کسی بھی زبان کے ادب و شعر میں عصری شعور نوع انسانی کے مجموعی وقوف اور تجربے کا حاصل گردانا جاتا ہے۔ نوع انسانی کا مجموعی وقوف وہ سماج ہے جو فرد کے تجربے کا میدان اور اس کی صلاحیتوں کو سنوارنے اور نکھارنے کا ضامن ہے۔ فرد اور سماج کسی بھی تہذیب کا قیمتی اثاثہ، عصر کا ناگزیر حصہ اور اس کے متحرک کل کی سب سے بڑی علامت ہیں۔ اردو زبان کے ادبی و شعری سرمائے میں فرد اور سماج کا ذکر دور قدیم سے عہد جدید تک برابر موجود رہا ہے۔ ماضی میں فرد پر سماج اور جزو ہر کل کو برتری حاصل رہی ہے۔ مگر جدید صنعتی دور کے آغاز کے ساتھ ہی زمانے کی حالت منقلب ہو کر ”فردیت“ کے جس تصور کو سامنے لائی اس کے تحت بشر اجتماعی تاریخ و تہذیب سے منہ موڑ کر ایک نئے احساس سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ احساس جدید تہذیب کا پیدا کردہ ہے جس کا آغاز مغرب میں سائنسی علوم و انکشافات کے فروغ سے ہوتا ہے۔ اس نئی فضا نے سب سے پہلے ماضی کے قدیم تصورات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی۔ چنانچہ تہذیب و تاریخ کے قدیم تصورات و عقائد پروار ہوا اور مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ مختلف صنعتوں کے قیام سے معاشرے میں نمایاں تبدیلیاں واقع پذیر ہوئیں اور ان مختلف النوع تبدیلیوں کے سیل بلا میں بشر افراتفری اور انتشار مسلسل سے دوچار ہوا اور اس پر مستزاد یہ کہ دو عالمی جنگوں میں وجود انسانی کی بے وقعتی اور پامالی نے ماضی کے متعینہ نظام ہائے حیات و اقدار کی بنیادوں کو اکھاڑ پھینکا۔ ہر شے سے اعتماد اٹھ گیا اور ہر حقیقت فسانہ بن کر رہ گئی۔ رشتوں کی ڈوریں ٹوٹ گئیں، سماج جو ایک زندہ کل کی حیثیت رکھتا تھا اور بشر جو سماج کا ناگزیر حصہ تھا پتنگوں کی طرح بکھر کر رہ گیا۔ اس نوع کی انسانی و سماجی صورتحال کے تناظر میں فلسفہ وجودیت کا ظہور ہوا جس نے اتر عالمی سماجی حالات کے تناظر میں اس سوچ کو پختہ کر دیا کہ وجود انسانی دنیا میں دکھوں کا منبع ہے۔ انسانی مسائل کا حل اور انسانی دکھوں کا درماں ممکن نہیں۔ اس دنیا میں انسان کو کسی صورت دہشت، خوف اور تنہائی سے نبرد آزما رہنا ہی ہے۔ دکھ لازمہ حیات ہیں اور دکھوں کے بوجھ تلے دبے انسان کا پرسان حال کوئی نہیں۔ وجود انسانی کی مجبوری و مقہوری سے کامل آگاہی کے باوجود وجودی فکر انسان کی بے معنی حیات میں ذاتی آزادی، ذاتی امنگ اور ذاتی اعتماد کا دیافروزاں کر کے فرد کی حیات اور اس کے ارد گرد بکھری کائنات میں اثبات ذات کے ذریعے جشن طرب پانے اور روشنی پھیلانے کی کوشش کرتی ہے۔ اردو ادب میں وجودیت باقاعدہ تحریک کی بجائے اپنے

انفرادی رجحانات و رویوں کے باعث شناخت رکھتی ہے۔ جس کا اظہار زمانہءِ قدیم سے عہد جدید تک کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا ہے۔ جدید اردو شاعری کے تناظر میں تقسیم ہند کی سماجی و بشری صورتحال نے جس نوع کے کرب، کھراؤ، بد اعتمادی و بے یقینی کو جنم دیا اس کا عکس کئی دہائیوں تک فرد اور سماج کے آئینے میں مختلف انداز سے بار بار ابھرتا رہا۔ ۱۹۵۸ء میں جنم لینے والی ”نئی شاعری کی تحریک“ نے لسانی تشکیلات کے تحت وجودیت ہی نہیں دیگر عالمی ادبی تحریکوں اور ملکی و عالمی، سماجی و سیاسی منظر نامے سے بھی اثر قبول کیا۔ لسانی تشکیلات کے تحت سامنے آنے والی تخلیقات روایتی شعری سرمائے کی پیروی سے دور ہیں۔ گوکہ شعری و تخلیقی انحراف کی مثالیں راشد، میراجی اور اس عہد کے دیگر شعرا کے ہاں بھی موجود ہیں مگر تخلیقی ہمہ جہتی کے لیے جس نوع کی بغاوت کا مظاہرہ لسانی تشکیلات کے تحت ہوا اس کی مثال ماضی میں موجود نہیں۔ ان شعرا نے لسانی تشکیلات کے عمل میں جس فرد اور سماج کو اپنی شعری تخلیقات میں جگہ دی، بیشتر شعرا کے ہاں اس کا ماضی سے کوئی رشتہ موجود نہیں اور اگر ہے بھی تو بہت کمزور۔ ماضی قریب میں فرد و سماج اور سماجی اقدار کے حوالے سے رد و انحراف کی مثال راشد کے ہاں موجود ہے لیکن راشد ماضی سے بغاوت کے باوجود ماضی کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔ راشد کی نظموں میں پیش کردہ فرد عہد جدید کا انسان ہونے کے اعلان کے باوجود بار بار مشرق وسطیٰ کے تابناک ماضی اور سماج کی طرف پلٹتا ہے۔ اسی بنا پر ان کی نظموں کا سماجی منظر نامہ عہد جدید کی افراتفری، نفسا نفسی، بوالہوسی، پڑمردگی، بیچارگی اور بے بسی کے زندہ لمحوں کی تصویر ہونے کی بجائے محض تصویری جھلکی معلوم ہوتا ہے۔ نیز ان کی زبان جدید عصری حسیت کو بھی ماضی کے ان دلفریب دھندلکوں میں کھینچ لے جاتی ہے جو مسلمانوں کے تابناک، مدفون عہد سے جڑا ہے۔ میراجی کے ہاں فرد و سماج ہندی دیومالا اور جنس میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ جبکہ ترقی پسندوں کے ہاں یہ صورتحال مادیت پرستی اور سیاسی نعرے کی نظر ہو جاتی ہے۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کے ارد گرد انفرادی شعری تخلیقات بھی فرد و سماج کے حوالے سے جدت کے نعرے کے باوجود ماضی کی بازیافت کی طرف مائل محسوس ہوتی ہیں۔ اس تمام شعری منظر نامے کے ساتھ جب نئے شعرا کی تخلیقات پر نظر جاتی ہے تو ان کی تخلیقات میں معاصر فرد اور سماج کے حوالے سے صنعتی، میکاکی اور مشینی تہذیب کے نتیجے میں پیدا ہونے والی پیچیدہ عصری صورتحال کو اس طور نشان زد کیا گیا ہے کہ پوری جدید تہذیب ان نظموں میں سانس لیتی محسوس ہوتی ہے:-

”قدیم بنجر سیاہ دڑوں میں بٹ گیا ہے شہر کی خرابہ گزر گاہوں کے ساتھ ناچتے اجنبی دیاروں کی
دھول قدیم معاونت کا عذاب، بھکنوں کی گرد، بہتے ہوئے جہنم کی راہ سینے پہ منتشر، سب شبہیں ہیں
انجام ریزہ، محال کی مشتبہ حرارت بدن دکھن تر مرے دھماکے تضاد راہوں میں گرتی بہتی اراد تیں،
میرے پاؤں بالکل ہی اٹ گئے ہیں مرے ارادے کی سیڑھیوں پر نزار صدموں کے عہد تہوار آبلوں
کی شکستگی ہے جو مسافت مزار دیوار ہو گئے ہیں۔ بیکار کا مزا شور تند تانید کے لئے بے طلب شکستہ
نصیب اعصاب پر ابھی سے محیط گردوں، زمانہ رگ رگ رواں دواں ہے۔ سوال بے چارگی کا موقع

گزر گیا کچھ تو مل گیا مریں بغاوت اداس راہوں کے سرد چہرے پہ جم گئی ہے۔“ (۱)

مندرجہ بالا نظم کا کلکڑا عہدِ جدید کے سماج میں انسانی صورتحال کی کسمپرسی اور بے بسی کی زندہ تصویر ہے کہ جہاں بشر کے ارد گرد بپا ہنگامہ ہے، ہستی میں انسان کا وجود بے وقعت اور بے قیمت ہو کر معمولی ذرات میں ڈھل گیا ہے۔ پیٹ کے ایندھن کو سرد کرنے کے لئے ٹھوکریں کھاتے انسان نما جانور اور سہانے دنوں کے خوابوں کے سہارے دیا غیر کی مشینوں کا ایندھن بننے مجبور انسانوں کے کرب کی تجسیم نہایت خوبی سے کی گئی ہے۔ بقول احتشام علی:-

”افتخار کی نظمیں مروجہ لسانی سختیوں کی شدید قسم کی شکست و ریخت کے باوجود

اس عصری شعور سے بھی برابر جڑت رکھتی ہیں۔ جس کے عقب میں صنعتی اور میکا کی تہذیب کے

ہاتھوں اضمحلال کا شکار ہوتے فرد کا المیہ پوری شدت کے ساتھ قاری کے سامنے آتا ہے۔“ (۲)

لسانی تشکیلات کے نمائندہ شاعر افتخار جالب کی نظموں میں فرد و سماج کا زندہ منظر ان کی شاعرانہ دقیق نظری، بین الاقوامی ادب کے مطالعہ ان کی قوتِ تخیل کی وسعتوں اور عالمی منظر نامے پہ دور رس نگاہ کا پروردہ ہے۔ ان کی نظموں میں فرد یا ”میں“ کا روپ استعاراتی توسیع کا روپ ہے۔ فرد کی انفرادی کلیت اجتماعی کلیت سے منسلک ہے۔ ”ماخذ“ کی نظموں میں انسانی رشتوں کی جو اسطور مرتب ہوتی ہے وہ فرد کی کلیت اور پھر اس کلیت کی اجتماعی کلیت کی اسطور ہے۔ فرد یا انسان کی کلیت کی لسانی ترتیب و تشکیل شعری عمل کا اصل اصول ہے۔ افتخار جالب نے شاعری اور جدید فلسفے کی اس مشترکہ بنیاد پر اپنے شعری شعور کی بنیاد رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی تخلیقات میں جدلیاتی شعور کو سمیٹا ہے کیونکہ جدلیاتی شعور زندگی اور سماج کو منجمد نہیں جانتا۔ بقول ڈاکٹر سعادت سعید:-

”انہوں نے نہ صرف اظہار کی کائنات میں اپنا عہد پیدا کیا بلکہ اپنے معاصر کئی اور شعرا کو

اپنے اپنے عہد کی تشکیل کا ادراک بھی عطا کیا۔“ (۳)

افتخار جالب کی نظموں میں فرد کی انفرادی آزادی کی کلیت، قومی خود مختاری کے مسائل، فلسطین و کشمیر اور دیگر مظلوم اقوام کا احساسِ محرومی اور ان کی مظلومی، جاگیر دارانہ سماج کی گھٹن اور سرمایہ دارانہ نظام کے استبداد، جدید تہذیبی معیارات، سامراجی نفسیات، سیاسی چالیں نوآبادیاتی مفلوک الحالی و محکومی تمام کے تمام معاملات ایک ہی کلیت کا حصہ ہیں۔ افتخار جالب انہیں الگ الگ خانوں میں تقسیم کرنے کے قائل نہیں۔ ان کی نظموں میں فرد و سماج کی زیست سے جڑے تمام تر مسائل و معاملات جذبہ ہے۔ بے اختیار کی صورت سامنے آتے ہیں اور سماج میں انسانی کشمکش کی اذیت ناک صورتحال کو مجسم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سعادت سعید کے الفاظ میں:-

”افتخار جالب کی شاعری کا بنیادی کردار انسانی کشمکش کی اذیت ناک صورت حال سے دوچار

آزادی کے انتخاب کا داعی ہے۔ افتخار جالب اور لسانی تشکیلات کا نظریہ ایک دوسرے کی پہچان

ہیں۔ لسانی تشکیلات تاریخ، زندگی اور سماج سے متعلق ہمارے ادب میں کلیتاً نیا نظریہ ہے۔ افتخار

جالب کے بقول مواد کا لسانی تشکیلات کی ہیئت میں تجزیہ کرنے سے رائج الوقت شعری معیارات سے نجات مل جاتی ہے۔ پرانے اور نئے کی واضح حد بندی ہو جاتی ہے۔“ (۴)

یوم مئی کا جلوس:

”مختلث لٹتی ہیں، عصمت کی طرح لٹتی، ہیں بازار کے بھاؤ کی خرابی میں حسیناؤں کی تقدیر بھی اُلٹی ہے سر عام اٹھاتے ہیں تمنائوں کی انمول حقیقت کا حساب ایسا نہیں، کوئی بتا بھی نہ سکے۔ لوٹنے والے مزے کرتے رہیں، عزتیں برباد بھی ہوں، لفظ زباں پر نہ رہے لطف کا یہ سلسلہ چلتا ہی رہے: کہنے کو سب کہتے ہیں: یہ ٹھیک نہیں! قسمیں لٹتی نہیں چائیں: یہ ٹھیک نہیں! کہنے کو سب کہتے ہیں:۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے! یہ ٹھیک نہیں، صاحبو! الزام نہیں، عین حقیقت ہے: یہ دن لوٹ کے، لکھ لوٹ کے ہیں آج نہیں یہ سالوں کا دستور ہے: جو صاحب قدرت ہے، اُسے میری ماں، بہن کی عصمت کو گھلے بندوں، سر عام، بلا خوف و خطر لوٹنے کا حق ہی نہیں، عین شرافت ہے: جزاک اللہ پھر یہ کہتے ہوں موز دور کا دن مل کے منائیں گے: جزاک اللہ“ (۵)

کشمیر کے حوالے سے

”خود ارادیت انسان کی حقیقت: گہے کا بوس گہے خواب کا بہروپ بھرے، عہد کی روداد لیے چلتی ہے: دوزخ کی ہوا؛ خونیں شفق وادی و کہسار کا ملبوس چمک دار نگاہوں کی چکا چوند، دلہن روپ کسے حوصلہ برداشت کرے داخل ایقان: رگ و پے میں سلگ اٹھتی شہادت نے خبر دی کہ مرا صحن جہنم تری روداد مری ایک ہی منحوس مسافت ہے، مرے گھر سے ترے کو بچے تلک، جانتا ہوں جانتا ہوں زندہ اساطیر کا پند شعبدہ فنجیر: اماں چاہتا: مجروح: مری ذات کی تعبیر ہے ناسفۃ وژولیدہ،

پشیمان (۶)

مندرجہ بالا نظمیں اس انسانی آزادی کی خواہش سے عبارت ہیں جو بشر کو روائتی، میکائلی، جاگیر داری اور سرمایہ دارانہ بیڑیوں سے مکت دیکھنا چاہتی ہے۔ آزاد انسانی انتخاب جہاں غلامی کا تصور ناپید ہو اور انسان انفرادی سیاسی، طبقاتی، معاشی، روایتی، اور بین الاقوامی آزادی کی تمنائوں سے سرشار ہو۔ بنگال کی خونناک مہک، ید اللہ فوق ایدہم، یوم مئی کا جلوس، وقتا عذاب النار، کشمیر کے حوالے سے، جان گھلاتے خواب، خاک و خون کا مجاہدہ، جیسی نظموں میں کامل آزادی کی یہ تڑپ بہت نمایاں ہے۔ دراصل افتخار جالب نوآبادیاتی نظام سے سمجھوتا کرنے کے بجائے اسے بے نقاب کرتے ہیں اور عہد جدید کے ملکی و بین الاقوامی سماج میں بشر کی غیر انسانی صورتحال کو انہوں نے لسانی تشکیلات کے ذریعے متاثر بے معنویت، پیچیدگی اور غلاظت کے ساتھ پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ ”مختلف

سامراجی طاقتوں کے توسیع پسندانہ عزائم، یک قطبی دنیا کا قیام، نیو ورلڈ آرڈر کے تحت اپنے مخصوص مقاصد کے حصول کی خاطر مغربی اقوام کا ترقی پذیر ممالک میں بڑھتا ہوا اثر و رسوخ، صارنی کلچر کے ذریعے مشرقی اقدار کی پامالی، عالمی صارنی معاشرے کے قیام کے بعد مختلف زبانوں کو لاحق خطرات اور بڑی طاقتوں کے مخصوص ایجنڈوں کے تحت تہذیبی و ثقافتی منابعوں کی زوال پذیری کے بیانیے ان کی نظموں میں پوری طرح جذب ہو کر سامنے آتے ہیں۔

”اے خوشا بخت کہ امریکہ نے
آدابِ سفارت کی بحالی کا ارادہ باندھا
ویت نام اک نئے دور میں داخل ہوگا
صنعت و حرفت و کلچر کی فراوانی میں
کوئی قلت ہے تو بس اتنی
الفاظ کی ناداری ہے!

☆☆☆

شیر بکری نے نئے گھاٹ کے دوارے، آرے
ورلڈ آرڈر کے بہیمانہ طلسمات نے ڈیرے ڈارے
ہم تہی دست تو پہلے ہی سے تھے، دیکھیے، مشروم فشن
شیر و شکر ہوتی زبانوں کا بطن، قربت و لاچاری کا لنگوا کچرا
ٹاکسک ویسٹ میں تبدیل کیے دیتی ہے: تاحد نگاہ زیست کا کوڑا المیہ۔۔۔ ہیر و شیماء کے دم عیسیٰ کا
ہر لحظہ نیا کن فیکون؟“ (۷)

ورلڈ آرڈر کے راج تلے پختی زر پرست اقوام جنہوں نے اپنی عزت نفس اور خود مختاری قرضوں اور
ڈالروں کے عوض فروخت کر دی ہوان کے سامنے مندرجہ ذیل نظم مثال آئینہ آویزاں ہے:-

”انھوں نے اعضائے مردی کاٹ کر عداوت خوشی سے کتوں کے آگے ڈالے
سنو، اگر بخش دو تو ہر دم غلام! منظور ہے؟
نہیں تو جتنا خراج چاہو، ادا کریں گے! قبول کرتے ہو؟
آؤ ممکن جو ہو سکے تو مصافحہ کر لیں، ٹھیک ہے؟“ (۸)

مشیینی و صنعتی تہذیبی غلبے میں، جہاں عالمی صارنی معاشرے میں ثقافتی و تہذیبی اجتماعت کسی عفریت کی
طرح فرد کی انفرادیت و شناخت کو ملیا میٹ کر رہی ہے۔ اپنے ہی لوگوں کی نفرت، حکومت غیر کے جبر اور شعوری
مراعات کی کٹھالی میں پکھلتا، نفسیاتی جبر سہتا ہوا وجود محرومی واکتاہٹ کے اندھیروں میں کھوجاتا ہے۔

’انیس ناگی‘ کے ہاں فرد اور سماج ایک ایسے کلچر کے تناظر میں ابھرتے ہیں کہ جہاں انفرادی و اجتماعی ذمہ داری کا تصور مٹ چکا ہے۔ معاشرہ اقداری انحطاط، احساس کمتری، عدم تحفظ اور عملی رجعت پسندی کا شکار ہے۔ تیسری دنیا کے نیم ترقی پذیر معاشروں میں کہ جو بین الاقوامی محتاجی اور اقتصادی محرومی سے باہر نکل ہی نہیں پائے لوگوں میں عدم انصاف اور اس کے نتیجے میں محرومی و اکتاہٹ کا احساس وجود کا ناگزیر عمل بن کر ابھرتا ہے اور لوگ معاشرتی احساسِ یگانگت تو دور، کسی خاص مقصد یا تصورِ حیات کے بنا محض جبلی سطح پر زندگی گزارے چلے جاتے ہیں:-

”میں جنوبی ایشیا کے ایک سے مرطوب کاغذ کی طرح جلتے سگلتے آرزوؤں سے تہی پس ماندگی میں

غرق شہروں میں جہالت اور ضلالت سے نمونپاتی زندگی کی دوڑ سے اکتا گیا ہوں“ (۹)

”کس کو خبر کہ ہم سب ادنیٰ حقیر کیڑے تغیر کے قریبوں میں مدتوں سے شامل اک دن یونہی ہوا

کے پھیلے خلا میں آ کر دم توڑنے سے پہلے بے مانگی کے ماتم میں الوداع کہیں گے“ (۱۰)

انیس ناگی کے ہاں جدید معاشرے میں فرد کا احساس بے مانگی، تنہائی و اجنبیت کی ان کیفیات کا آئینہ ہے جو عہدِ جدید کی مخصوص حسیت کا زائیدہ ہے۔ ان کیفیات کا ردِ عمل اس باطنی خلا کی صورت نمودار ہوتا ہے جو فرد کو گرد و پیش سے بیگانہ کر کے خود میں سمٹنے پر مجبور کر دیتا ہے:-

”کہ میں خود آگہی کے بھاری سانسوں کا سمندر ہوں جسے نمکین پانی کی سزا آبادیوں سے دور رکھتی

ہے۔“ (۱۱)

یہ نمکین پانی زندگی کی حقیقی لطافتوں اور الفتوں سے تہی ذات بھی ہے اور بشر کے کرب کی علامت بھی جو جدید معاشرے میں ہر باضمیر اور احساس انسان کا مقدر ہے۔ انیس ناگی کے کلیات میں ’نوحہ‘ کے عنوان کے تحت پیش کردہ نظمیں عہدِ جدید کے اسی انسان کا نوحہ ہیں جو اپنی فطرت کو فراموش کر کے زر کے تعاقب میں اتنا دور نکل گیا ہے کہ اب اپنی اصلیت و حقیقت تک واپسی ناممکن ہو گئی ہے۔ یہاں جدید سماج کے بوالہوس انسان کے متعدد روپ ابھرتے اور غائب ہوتے ہیں کہ جو انسانیت کے نام پر دھبہ بن کر رہ گیا ہے۔ جس کے لیے زیست محض لمحوں کا بہلاوا اور نفسا نفسی کی دوڑ میں سب کو پچھاڑ دینے کا نام ہے۔ اور نتیجہ ایک مسلسل اذیت، بیزاری، بے دلی اور گھٹن ہے۔

”چینیوں سے نکلتا دھواں بالٹی میں ٹپکتا ہوا گرم پانی زمین پر گرا سرخ صابن کلون کی مہک سے فضا

رنگ رنگ اوہ! وہی ناشتہ ایک بیزاری خاکی زندگی ایک منحوس سی دفتری زندگی خواب آنکھوں میں

کوئی نہیں منظروں کے دیئے بچھ چکے بدن کی مہک بھی نہیں زندگی ایک تلوار کی دھار ہے جس پہ

میرے قدم رات کے پیر بن کا سہارا لیے اور کبھی دن کی رسی کو تھامے ہوئے چل رہے

ہیں۔“ (۱۲)

”سلیم الرحمن“ کے ہاں فرد کا وجود اک ایسے معاشرے میں ابھرتا ہے جس کی بنیادیں کھوکھلی اقدار پر قائم

ہیں۔ اور آج کا حقیقت پرست فرد ان اقدار و اثاثوں، عقائد و تصورات کو اپنی ذات سے دور پھینک دینا چاہتا ہے کہ جو اپنی حقیقت، اپنا اثبات نہ کروا سکیں۔ چنانچہ سلیم الرحمن کے ہاں ابھرنے والا فرد داخلی و خارجی خلفشار کے درمیان لڑکھڑاتا وہ باغی ہے جس نے احترام آدمیت کی کھوکھلی روایات اور مابعد الطبیعی سہاروں سے خود کو آزاد کروا کے زندگی میں بے یقینی، تضاد اور مہملیت کا راستہ اختیار کیا ہے۔

بقول محمود شام

”سلیم الرحمن نے سارتر کی طرح اس زندگی کی مہملیت کو محسوس کیا ہے۔ سارتر کا کہنا ہے کہ اس

دنیا میں نہ تو نیکی ہے نہ کوئی قدر اور نہ ہی دنیا کا کوئی مقصد ہے یہ میری ہے اور مہمل ہے۔“ (۱۳)

ماضی کی تہذیبی و اقداری روایت کے رد کے بعد سلیم الرحمن کی نظموں کا فرد حال کے جن لمحوں کا مبین ہے وہ انسانی حیات کے لیے سراسر اذیت، کرب اور آزمائش سے عبارت ہیں۔ ماضی کی پناہ گاہ سے دوری اور حال کی اذیتوں سے دوچار ہونے کے بعد شاعر یا فرد کے لیے ایسی کوئی شمع امید فروزاں نہیں ہے کہ جس میں وہ خوش آئند مستقبل کے خواب جھلملاتے دیکھے چنانچہ جدید سماج کا فرد صنعتی و مشینی تہذیب کے آگے اپنی حیات کو بے معنی تصور کرتے ہوئے اس بات کا برملا اظہار کرتا ہے کہ:-

”میرے اور موت کے درمیان سانس کا ایک لمحہ ہے اور عمر کا ایک جھوٹا

مرے واسطے زندہ رہنے کا کوئی بہانہ نہیں ہے۔“ (۱۴)

سلیم الرحمن کی نظمیں جدید صنعتی سماج میں حصول تعیشات کی غرض سے اپنی زندگی کو گروی رکھنے والے ایسے انسانوں کا قصہ بھی بیان کرتی ہیں جو تلاش زر میں بے وطنی کا عذاب سہتا خاک ہو جاتا ہے۔ کم مائیگی، ذلت، دھتکار اور تنہائی کی کرچیاں اس کی شخصیت کو اس قدر مسخ کر دیتی ہیں کہ خود اپنی شناخت بھی محال ہو جاتی ہے۔ بقول جیلانی کا مران:-

”شام کی دلیلیز“ جبر اور تقدیر کی مرتب کی ہوئی دستاویز ہے۔ جس میں انسان مجبور و محکوم ہے، اشیا

اس کے اختیار سے باہر ہیں اور وہ صرف ایک بے جان مزدور کی طرح زندگی کا سفر طے کرتا

ہے۔“ (۱۵)

”میں نے دیکھا ہے اسے اور لی اور پتھر پر ہاتھ میں تھامے ہوئے کاغذ کے پرزے ورک پر

مٹ، اجنبی گناہ لوگوں کے پتے مفلسی کا بوجھ غم کے سوٹ کیس“ (۱۶)

چنانچہ عہد جدید کا یہ بے بس انسان زندگی میں کسی بشارت اور خوش کن امید سے دور اپنی عزت نفس کو سرمایہ دارانہ نظام کے ہاتھوں گروی رکھ کے سسکتے سسکتے اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔ اور اس سے منسلک رشتے مادی آسائشات کے بوجھ تلے ہنسے مسکراتے اس مانوس اجنبی کو فراموش کر دیتے ہیں کہ جوان کی بقا کا ایندھن بنا۔

”شام کی خاموشی ہی سبق ہے میرے لیے بگڑی ہوئی تقسیم ہوں کیا کیا ملکوں اور زبانوں کی

راستوں اور وعدوں کی اور زمانوں کی رات اور دن کی سرحد میرے بیچ سے ہو کر گزری ہے کتنا ہوا
اپنا سر ہاتھوں میں تھامے تھکے تھکے قدموں سے رات کے زینے پر چڑھتا ہوں میں اپنی جدائی کا
قصہ دہرانے کو میرے خون کی بلیں نیچے سیڑھی سیڑھی پھیلی ہیں۔“ (۱۷)

”تبسم کاشمیری“ کی نظموں میں لسانی تشکیلات کا عمل جس فرد اور سماج کو پیش کرتا ہے وہ عہد جدید کا ہی
عکس ہے۔ ان کے ہاں معاشرہ مادی ضروریات کے اس کارخانے کی صورت سامنے آتا ہے جہاں لمحاتی لذتوں کی
خاطر رشتوں کو بے دریغ خام مال کی صورت استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسے میں سماج کا فرد خواہ وہ عورت ہو یا مرد شوکیں
میں رکھی ایسی چیز بھی بن جاتا ہے کہ جسے مطلوبہ قیمت ادا کر کے خریدا جاسکتا ہے۔ تبسم کاشمیری کے ہاں فرد سماج کا
قصہ آپ بیتی کی صورت بھی عیاں ہوتا ہے اور جگ بیتی کی صورت بھی۔ عصر جدید کے اس سماج میں کہ جہاں اخلاقی
اقدار و روایات، حرمت، ضمیر، ظرف، احساس عظمت و توقیر وہ پرانی اور ازکا رفتہ اشیاء بن گئی ہیں کہ جنہیں ہوس زر
کے کرم نے کھوکھلا کر ڈالا ہے تبسم کاشمیری مٹتے ہوئے انسان کا نوحہ کہتے گریاں کنائیں بھی نظر آتے ہیں اور طنز کی چھین
سے سوئے ہوئے احساس آدمیت کو جگانے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ تبسم کاشمیری کی لسانی تشکیلات میں سماجی فرد
کے مقابل شاعر کی ذات فعال بھی ہے اور بیدار بھی۔ وہ اپنے سماج اور اس کی صورتحال سے بیزار اور دکھی تو ہیں مگر خود
احتسابی کے عمل سے اس صورتحال کو بدلنے کی سعی میں بھی پیہم مصروف ہیں۔ انیس ناگی کے بقول:-

”وہ کسی قبل از وجود اخلاقی ضابطے کو قبول کرنے کی بجائے اپنے ارد گرد میں موجود زندگی اور
نظموں پر کاٹتی ہوئی نگاہ ڈالتا ہے، وہ انسانی تظلم، معاشرتی ناہمواری اور انسانی منافقت کو انسان
کا سب سے بڑا دشمن گردانتے ہوئے احتجاج کی صورت میں اپنے رد عمل کو منظم کرتا ہے۔ چنانچہ
ان کی نظموں میں ایک خصوصی معاشرتی سیاق و سباق میں زندگی کو بسر کرنے کا چلن ملتا ہے۔ یہ تبسم
کاشمیری کی اخلاقی دیانت ہے کہ وہ معاشرتی نا انصافی کے ماحول میں رہتے ہوئے اس میں
شرکت کرنے پر مجبور ہے۔ اس احساس کے نتیجے کے طور پر اس کی نظموں میں احساس جرم کی
کیفیت بڑی شدت سے ملتی ہے۔ بلکہ اسکی بیشتر نظمیں اسی احساس کی پیداوار ہیں، وہ اپنے
معاشرے کے اجتماعی جرم کو سارے کے کردار فراز کی طرح قبول کرتا ہے۔“ (۱۸)

”یہ کیسا زہر ہے جو پھیلتا جاتا ہے معدے میں یہ کاری زہر ہے جو رات کے معدے سے ٹپکا ہے
تشدد، خوف، دہشت، بربریت رات کے کالے تم گریساہ ماتھے پر ندامت ہی ندامت“ (۱۹)

تمثال کی تمام نظمیں اسی انسانی و سماجی صورتحال کی عکاس ہیں جہاں انسان کا وجود مختلف ٹکڑوں میں بٹا
اجتماعی خود غرضی و بے گانگی، کے گرداب میں برسر عمل ہے۔ جدید سماج کے کار و بار حیات میں منافقت سب سے بڑا
قریب ہے جس نے انسان کی اصلیت چھین کر اسے تہی دست کر دیا ہے کہ یہی آج کے دور کا چلن ہے۔ اور انسان چاہ
کر بھی اس سے نجات نہیں پاسکتا تچن دا غلی کرب و گھٹن اس کی سانس کا رستہ تنگ کر رہی ہے۔

”شام گزری تو لمحے لمحے کا اجنبی اپنے گھر کو لوٹا لوگ کچھ کھڑے تھے ”کون ہو تم“ وہ پوچھتے تھے ”میں وہی ہوں جو صبح گزرا تھا اس گلی سے“، نہیں نہیں تم وہ نہیں ہو، وہ اور کوئی تھا، دو پہر کو بھی تم نہیں تھے۔۔۔۔۔ میں تو تھے اور بننے لحوں کے جبر میں ہوں میں کب سے بننا ہوں ٹوٹنا ہوں بکھر رہا ہوں ”مگر یہ کیوں ہے؟“ وہ سوچتا ہے سوچ کالی لکیر بن کر بدن میں اس کے اتر گئی ہے عقبی حملوں سے جنم زخمی ہے اپنا چہرہ اٹھا کے ہاتھوں میں رات بھر اب وہ چیتا ہے“ (۲۰)

مجموعی طور پر تسم کا شیر کی کے ہاں فرد اور سماج کا عکس ایک پُر آشوب ماحول کے تناظر میں کرب کی لہر بن کر ابھرا ہے۔ اس سماج کا فرد مغلوب اور دکھی ہے جس کے نالے میں عصرِ جدید کی پوری کہانی بھی موجزن ہے اور اس سماج میں بسنے والے انسان کی سوانح عمری بھی۔

”ہم اونچی چینیوں میں شور کرتے کارخانوں میں دھوئیں سے پیٹ بھرتے ہیں ہمارے نامہ اعمال میں ہرگز نہیں بخشش فرشتے ہم سے نالاں ہیں ہمارے سرخ ہاتھوں پہ گناہوں کی لکیریں ہیں۔“ (۲۱)

”سعادت سعید“ کی لسانی تشکیلات میں فرد و سماج کا منظر نامہ عصرِ جدید کی بدہمتی، بد وضعگی اور کراہت کو منعکس کرنے کے لیے ملمع سازی سے دور فرد کے شدید داخلی کرب کو کریمہ متناہوں اور بدہمت پیکروں کے ذریعے واضح کرتا ہے۔ جدید زر پرست منافق سماج میں فرد کا قلبی، ذہنی و فکری انتشار زوال پذیر تہذیب کے طے پر اپنی بے بسی کے نوے کہتا ہے اور وہ انسان کو رد آدم علییل صورت گردانتے ہیں جس کے لیے زندگی ذلتوں کی وہ راہ ہے کہ جسے عبرت و تکریم کے ساتھ فنا کی بہتی نالیوں کے کچھڑے سپرد کر دیا گیا ہو۔ ”طمع کے چوہوں نے ریشہ ریشہ دکھتی آنتیں کاٹ ڈالیں میں ہاتھ روموں میں گیلی گیلی دھڑکتا کاغذ کبھی میں ذلت بھرا وہ کش ہو کہ جس کا امکاں بدن میں سرطان بھر گیا ہومری رگوں میں وہ آگ اترے کہ سر سے پاؤں کے ناخنوں تک میں راہ ہو کر فضا میں بکھروں تو زندگی رنگ غلیظ ہونٹوں سے ذرہ ذرہ نحیف پیٹوں میں جا کے ٹھہرے۔“ (۲۲)

’حیات کیا ہے وہ فاسد مواد زخموں کا جسے لپیٹ کے روئی کے چند گالوں میں غلاطوں کی چلچلی میں دھو کے ڈالا گیا‘ (۲۳)

عبدالرشید کی لسانی تشکیلات فرد و سماج کا جو منظر نامہ مرتب کرتی ہیں وہ بھی صنعتی و مشینی عہد کے زوال سے عبارت ہے۔ جہاں فرد اپنے ہونے کا عذاب بے حسی کی صورت میں جھیلتا ہے۔ انہوں نے فرد و سماج کی حقیقی کہانی کہنے کی کوشش کی ہے۔ جدید سماج میں فرد کی ذات تاش کا وہ بے وقعت و بیکار پتہ ہے جسے بے رحمی سے تقدیر کے جابر ہاتھوں نے سماج کے ڈھیر پہ یوں پھینک دیا ہے کہ اس میں اٹھنے کی سکت باقی نہیں رہی ہے۔ عبدالرشید کی لسانی

تشکیلات میں فرد مسلسل اپنی تلاش میں ہے۔ مگر منزل کو پا نہیں سکا۔ فرد کے ارد گرد بکھرا سماج ایک زندان کی صورت ہے جو سانسوں پہ گھٹن کے پہرے بڑھاتا چلا جا رہا ہے۔ ایسے میں فرد زندگی کی مسرتوں، لطافتوں اور تسکین سے تہی اپنے لخت لخت وجود کو سمیٹنے میں ہمہ تن معروف ہے۔ عبدالرشید کے ہاں سماج کی خونخواری کے مقابل شبیہ انسانیت پر ہول شکلوں میں ڈھلتی جا رہی ہے۔ کفر والحاد کے عناصر فروغ پا رہے ہیں۔ بشر تضادات کی زد میں ہے۔ قید روز و شب اس کا نصیب ہے۔ اس کی عظمت کی کہانی قصہء لہ پارینہ ہوئی، خوابوں کے دریچے ویران اور خواہشوں کے جنگل میں بشر مسلسل بھٹک رہا ہے مگر نشان منزل ہویدا نہیں۔ منزل تک پہنچنے کے لیے اپنی پہچان اپنی شناخت لازم ہے مگر سماجی صورتحال کی ابتری الجھی ہوئی گتھیوں کو اور الجھاتی جا رہی ہے۔ ایسے میں زندگی ٹکڑوں کی صورت بکھری ہے اور سچائیاں توڑ پھوڑ کی زد میں ہیں۔

عباس اطہر، زاہد ڈار، احمد ہمیش، اختر احسن، آفتاب اقبال شمیم اور دیگر شعرا کے ہاں فرد اور سماج کا منظر نامہ حقیقی انسانی صورتحال کا عکاس ہے۔ جہاں بشر مسلسل بے چینی، خوف، بے یقینی سہم ناک، اور احساس مرگ میں مبتلا ہے۔ ان کے ہاں سماج کا کوئی مثالی تصور نظر نہیں آتا جو سماجی آشوب اور زیست کی خوفناکیوں میں پر مسرت حیات کا وسیلہ بن سکے۔ یہ تمام تر صورتحال حیات سے بیزاری کا شاخسانہ نہیں بلکہ عہد جدید کی وہ حسیت ہے جو معاصر عہد کی انسانی صورتحال کے لطن سے برآمد ہوتی ہے۔ نئے شعرا کے ہاں یہ سماجی حسیت جغرافیائی حدود بند یوں سے ماوراء تمام دنیا کو محیط ہے۔ بقول انیس ناگی ”بشریت کا یہ رزمیہ زماں و مکاں کی عارضی حدود کو قبول نہیں کرتا۔ یہ مختلف علاقوں میں طلوع و غروب ہوتا رہتا ہے۔ یہ مغرب کی باتیں نہیں مشرق میں ظہور پذیر حقیقتیں ہیں جو نئے فنکار کا الہام ہیں نئے شاعر کا شعور اگر ایک طرف سات سمندر پار کے تہذیبی منطقوں سے متاثر ہوتا ہے تو دوسری طرف اس کی جغرافیائی حدود اسے ایک مخصوص ماحول میں شرکت پہ آمادہ کرتی ہیں۔ اس کا جغرافیائی حدود اربع اور اس کی رنگت نئے شاعر کے لیے ذہنی محل کو سمجھنے کا ایک اعلامیہ ہے۔ اس کا حدود اربعہ اس کے لیے ساری انسانی صورتحال سے ایک رابطہ ہے۔“ ۲۴ چنانچہ نئے شعرا کی نظموں میں جس سماج کی جھلک نظر آتی ہے وہ شعراء لہ کے اپنے حدود اربعہ سے ہی منسلک نہیں بلکہ اس کی شناختی سرحدوں سے پرے پوری انسانیت کا سماج ہے۔ ان شعرا کی نظموں میں ابھرنے والے مسائل انسانیت کے مسائل ہیں۔ چنانچہ ان مسائل پہ ان کا رد عمل پوری انسانیت کا رد عمل بن جاتا ہے۔

”یہ دن اٹل ہے وہ دیکھ آ نکھیں پگھل کے لکیں شعور چڑھتے ہوئے دنوں کا زمین پہ پھیلا تمام میں

ہوں، تمام تم ہو کھڑا ہوں سینہ سپر کھڑا ہوں خلاف اپنے کہ جنگ جیتوں تمام وقتوں کے فیصلوں

کی۔“ (۲۵)

مجموعی طور پر سماجی صورتحال کے کرب کا یہ احساس لحاظی نہیں بلکہ یہ المیہ شاعر کی ذات و تخلیقات کا

لازمی حصہ ہے۔ لسانی تشکیلات کے عمل میں نئے شعرا کے ہاں فرد اور سماج کی صورتحال ماضی کے

برعکس ایک بھرپور اور کامیاب تصویر بن کے ابھری ہے۔ جس میں جدید معاشرے میں فرد کے حوالے سے پہنچی اجنبیت، بعد، دشمنی، نفرت، لوٹ کھسوٹ، حق تلفی، اجتماعی جبر و بے حسی جیسی منفی اقدار کو بے نقاب کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ معاشرتی سدھار کے حوالے سے ان شعرا نے با آواز بلند ظلم و جبر کی قومی و بین الاقوامی قوتوں کے خلاف احتجاج ریکارڈ کروایا ہے۔۔۔

لسانی تشکیلات کا یہ عمل قدیم معاشرتی اسباب و علل کے تناظر میں نئے عہد سے جنم لیتے واقعات و حادثات کی گونا گوں اشکال کی نمائندگی کرتا ہے اور نئے معروضی و جوہری تجربات کو مرہجہ زبان کی شکست و ریخت اور نئے لسانی محاورے کے ذریعے متشکل کرتا ہے۔ اس نوع کی نظموں میں موضوع کی یکسانیت کے باوجود تنوع اور رنگارنگی کا احساس نمایاں ہے۔ لسانی تشکیلات کے فریم میں جڑی یہ تصویریں نئے سماج میں نئے انسان کے الجھاؤں، ذات کی شناخت، سچائیوں کی کھوج اور نئے حالات سے فرد کی نبرد آزمانی اور جفاکشی کا مجسم قصبہ ہیں۔ جن کی انتشاری کیفیات کو مقید کرنے کے لیے نئے شعرا نے لسانی شکست و ریخت اور تغیر و تبدل کے عمل کو اپنا کر بے مہابہ عصری انتشار و ٹوٹ پھوٹ کو مجسم کرنے کی سعی کی ہے ”کیونکہ نئے معروضی اور جوہری تجربات زبان کی شکست و ریخت کے بغیر معرض وجود میں آنے سے قاصر ہیں۔“ (۲۶)

حوالہ جات:

- ۱۔ افتخار جالب ”لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر“، کراچی القادر پریس ۲۰۰۱ء، ص ۱۶۵
- ۲۔ احتشام علی، ”جدید اردو نظم میں عصری حسیت“، لاہور سانجھ، ۲۰۱۵ء، ص ۱۵۴
- ۳۔ ڈاکٹر سعادت سعید، ”نئی شاعری: ایک جدلیاتی محاکمہ“، مشمولہ ”معیار ۱۰“، اسلام آباد، شعبہ اردو، کلیہ زبان و ادب بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، ص ۱۵۴
- ۴۔ ایضاً، ص ۱۵۵
- ۵۔ افتخار جالب ”یہی ہے مراحن“، لاہور، ملٹی میڈیا انفیرز، جون ۲۰۰۴ء، ص ۱۵
- ۶۔ ایضاً، ص ۱۱
- ۷۔ ایضاً، ص ۸۹-۹۰
- ۸۔ ایضاً، ص ۱۰۲
- ۹۔ انیس ناگی، ”بے خوانی کی نظمیں، لاہور مکتبہ جمالیات، ص ۴۱
- ۱۰۔ انیس ناگی، ”بیگانگی کی نظمیں کلیات شعر“، لاہور: جمالیات، ۲۰۰۰ء، ص ۶۵
- ۱۱۔ ایضاً، ص ۵۱

- ۱۲۔ ایضاً، ص ۶۲
- ۱۳۔ محمود شام، ”میری صورتحال“، مشمولہ ”نئی شاعری“، افتخار جالب (مرتبہ) لاہور: نئی مطبوعات، ص ۱۷۶
- ۱۴۔ سلیم الرحمن ”شام کی دہلیز“، لاہور: لوگ، ۱۹۹۳ء، ص ۱۶
- ۱۵۔ جیلانی کامران ”نئے لکھنے والوں سے میری ملاقات“، مشمولہ ”نئی شاعری“، ص ۱۳۸
- ۱۶۔ سلیم الرحمن ”شام کی دہلیز“، ص ۵۸
- ۱۷۔ سلیم الرحمن، ”نظمیں“، قوسین: لاہور ۲۰۰۲ء، ص ۸۴
- ۱۸۔ انیس ناگی، پیش لفظ ”تمثال“، از تبسم کاشمیری، لاہور: ارسلان پبلی کیشنز، ۱۹۷۵ء، ص ۱۲
- ۱۹۔ تبسم کاشمیری، ”تمثال“، لاہور: ارسلان پبلی کیشنز، ۱۹۷۵ء، ص ۳۹
- ۲۰۔ ایضاً، ص ۳۷-۳۸
- ۲۱۔ ایضاً، ص ۱۳
- ۲۲۔ ڈاکٹر سعادت سعید، ”کجلی بن“، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۷۶-۷۷
- ۲۳۔ ایضاً، ص ۶۳-۶۴
- ۲۴۔ انیس ناگی، ”نئی شاعری کا منصوبہ“، مشمولہ ”نئی شاعری“، افتخار جالب (مرتبہ)، ص ۵۰
- ۲۵۔ انیس ناگی ”بیگانگی کی نظمیں“، ص ۶۴
- ۲۶۔ ڈاکٹر سعادت سعید، ”آزادی اور ذمہ داری کی شعریات“، مشمولہ ”کجلی بن“، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص ۱۵

مآخذ:

- ۱۔ احتشام علی، ”جدید اردو نظم میں عصری حسیت“، لاہور سانچہ، ۲۰۱۵ء
- ۲۔ افتخار جالب ”لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر“، کراچی القادر پریس، ۲۰۰۱ء
- ۳۔ افتخار جالب ”یہی ہے مرا لحن“، لاہور، ملٹی میڈیا انٹیرز، جون ۲۰۰۴ء، ۱۵
- ۴۔ انیس ناگی، ”بے خوابی کی نظمیں“، لاہور مکتبہ جمالیات،
- ۵۔ انیس ناگی، ”نئی شاعری کا منصوبہ“، مشمولہ ”نئی شاعری“، افتخار جالب (مرتبہ)،
- ۶۔ انیس ناگی ”بیگانگی کی نظمیں“، لاہور: جمالیات، ۲۰۰۰ء
- ۷۔ انیس ناگی، پیش لفظ ”تمثال“، از تبسم کاشمیری، لاہور: ارسلان پبلی کیشنز، ۱۹۷۵ء،
- ۸۔ ڈاکٹر سعادت سعید، ”کجلی بن“، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء
- ۹۔ سلیم الرحمن ”شام کی دہلیز“، لاہور: لوگ، ۱۹۹۳ء